ہپی مراد

از

ابن صفی

کمپوزنگ : یاسر حسنین

پیشکش : انتظامیہ دی گریٹ ابن صفی فینز کلب

نوجوان ہی تھا، گریجویٹ بھی تھا لیکن ہپّی بن گیا تھا۔ عجیب دھج تھی۔ لباس مَیلا اور بے ڈھنگا، چرس کے دھوئیں کی بو میں بسا ہوا۔ بے تحاشہ بڑھے ہوئے سر اور داڑھی کے بال۔ عام ہپیوں کی طرح مارامارا نہیں پھرتا تھا بلکہ اس سلسلے میں اس نے ایک جدت کی تھی۔ ایک گدھا خرید لیا تھا اور اس پر بیٹھ کر جگہ سے دوسری جگہ جاتا تھا۔ آواز بڑی اچھی تھی۔ تھوڑا ساد خل فن موسیقی میں بھی رکھتا تھا اس لیے اس کی خاصی آؤ بھگت ہوتی تھی اور اتنا کچھ مل جاتا تھا کہ چرس اور گدھے کا خرچہ نکل آئے۔ رہی بات پیٹ بھرنے کی تو اس کا قول تھا کہ جس نے یہ تنور بنایا ہے وہی اس کو بھرے گا بھی۔

جن لوگوں نے اسے بحیثیت طالب علم دیکھا تھا وہ اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے کہ ایک بہترین دماغ ضائع ہو گیا۔

جدید ذہن اور غیر ملکی انداز فکر رکھنے والی خواتین میں بہت مقبول تھا۔ پڑھا لکھا اور ذہین بھی تھا۔ اس لیے وہ ان کے درمیان درویش بھی بن جاتا تھا۔ کسی کو تعویذ لکھ کر دے رہا ہے، کسی کے لئے گنڈا بنا رہا ہے اور کسی کے لئے اپنے مخصوص انداز میں دعائیں کر رہا ہے۔

کبھی کبھار منشیات کے اسمگلرز کے ہتھے چڑھ جاتا اور وہ اس سے منشیات کی تقسیم کا کام بھی لیتے۔ دراصل اونچے طبقے کی عورتوں میں وہ مقبول تھا۔ اس لیے ان کے درمیان ہیروئن وغیرہ کی تقسیم میں اسے آسانی ہوتی تھی۔ کبھی کبھار پولیس بھی اسے استعمال کرتی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے انفارمر بھی بن جاتا تھا... کسی کام میں بھی پیچھے نہیں تھا۔

ایک دن اس کا فارسی کے استاد سے ٹکراؤ ہو گیا۔ مولانا خلیل درانی جنہوں نے اسے میٹرک میں فارسی اور اردو پڑھائی تھی، اس کا گریبان تھام کر اسے گدھے سے اتار لیا۔ دو تین تھپڑ رسید کئے اور

اسی طرح کھینچتے ہوئے اپنے گھر لے آئے۔ بیٹھک میں بٹھادیا... اور وہ چھڑی اٹھائی جس سے اپنے طالب علموں کی مرمت کیا کرتے تھے۔ ہپّی صبح قدیم گڑگڑانے لگا۔ ”مم... مولوی صاحب! معاف کر دیجئے اب کبھی آپ کی نظروں کے سامنے نہیں آؤں گا۔“

”مردود، تونے یہ کیاحلیہ بنایاہے؟“ مولوی صاحب بید ہلا کر گرجے۔

”میں نے نہیں بنایامولوی صاحب، وقت نے اس حال کو پہنچایاہے۔ سبھی اپنے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں، کون کس کی سنتاہے۔“

”لیکن تجھے میری سننی پڑے گی۔ میرا حق ہے تجھ پر۔ ارے ظالم... توکیسے مذہبی خیالات رکھتا تھا۔ دین سے تیری دلچسپی اسکول میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ تو ایک پولیس والے کا بیٹاہے، پھر یہ تجھے کیاہو گیا...؟“

ہپی مراد اس حوالے پر بے ساختہ رو پڑا۔ ہچکیاں لگ گئیں۔ مولوی صاحب نے پانی کا گلاس پیش کیاجب جی کچھ سنبھلا تو بولا۔ ”میرا باپ پولیس والا ضرور تھامولوی صاحب لیکن میں اس وقت جو کچھ بھی تھا اسی کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ وہ بڑااصولی آدمی تھامولوی صاحب۔ صوم وصلوٰۃ کاپابند تھااور کوئی شرعی عیب اس میں نہیں پایاجاتا تھا۔ چار افراد کا مختصر خاندان تھا۔ میں تھا، میری چھوٹی بہن تھی اور ماں تھی۔ رشوت کی ایک پائی گھر میں نہیں آتی تھی کبھی۔ خالص تنخواہ پر گزارا تھا۔ اسی میں ہم دونوں بھائی بہنوں کی تعلیم بھی ہو رہی تھی لیکن میری ماں بڑی بے صبری تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی حیثیت سے اونچے لوگوں کی ریس کرنے کی کوشش کرتی تھی، لیکن باپ کے آگے ایک نہ چلتی۔ ہائی اسکولوں کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے کئی چھوٹے موٹے ٹیوشن کر لئے اور ان سے اپنے اور بہن کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے لگا۔ باپ بہت خوش ہوا۔ اس طرح بار کچھ ہلکاہو گیا تھا۔ پولیس والوں میں وہ شاہ جی کہلاتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اور کسی تھانے پر بھی اسے کوئی تھانے دار رکھنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر اسے ہیڈ

آفس کی محرری پر لگا دیا گیا۔ یہاں بھی آمدنی کے بہتیرے ذریعے تھے لیکن قصہ انفرادی آمدنی کا تھا۔ لہذا یہ میرے باپ کی مرضی پر منحصر تھا کسی سے کچھ لیتا یا نہیں۔ اس آمدنی میں کوئی اس کا حصہ دار نہیں تھا کہ اسے میرے باپ سے شکایت کا موقع ملتا۔ بہر حال شاہ جی سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے اور میری ماں دن بھر --+

دانت پیستی اور کلکلاتی رہتی۔ لیکن بہر حال جب ہم تینوں مل کر اسے سمجھاتے تو کچھ دنوں کے لیے نرم پڑ جاتی۔ کہیں کوئی سرکاری کوارٹر نہیں ملا تھا۔ کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور خدا کے فضل و کرم سے ہمارا گھرانہ محلے میں نیک نام تھا۔ لوگ ہماری عزت کرتے تھے۔

پھر اچانک ہماری بدنصیبی کا دور شروع ہوا۔ ہمارے برابر کا مکان خالی ہوا اور معلوم ہوا کہ اسے انکم ٹیکس کے ایک تپے دار نے کرائے پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ میرے والد سے ملا اور اس بات پر بڑی خوشی ظاہر کی کہ اسے ان کا پڑوسی بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

پھر جب اس کا سامان آنے لگا تو میری ماں کی آنکھیں کھل گئیں۔ فریج بھی، تھا ٹی وی بھی تھا، دو موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ چھ سات افراد پر اس کا کنبہ مشتمل تھا۔ جس شام وہ لوگ آئے ہمارے مہمان رہے۔ میرے باپ نے ان کا چولہا نہیں جلنے دیا۔ ہمارے گھر سے کھانا پک کر گیا تھا۔ میری ماں نے باوا سے پوچھا۔ ”کیا تپے دار کوئی بہت بڑا افسر ہوتا ہے؟“

”ارے نہیں!“ باوا ہنس کر بولے۔ ”اس محکمے کے چپراسی تپے دار کہلاتے ہیں۔ یہ تاجروں اور انکم ٹیکس ادا کرنے والوں کے پاس نوٹس لے کر جاتے ہیں۔“

”اللہ کی قدرت! یہ چپراسی ہے؟“ ماں سینہ پیٹ کر بولی۔ ”اور تم ہیڈ کانسٹبل ہو کر گھر میں چوہے لوٹ رہے ہیں۔“

"بس بس، باتیں نہیں۔" باپ نے بگڑ کر کہا اور معاملہ اس وقت رفع دفع ہو گیا۔ لیکن۔ میری ماں کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ دوسرے دن تپے دار کے گھر کی عورتیں ہمارے ہاں آئیں اور انہیں زیورات سے لدا پھندا دیکھ کر ماں کی حالت غیر ہوئی۔ ان کے جاتے ہی اس نے طوفان برپا کر دیا۔ باوا ڈیوٹی پر تھے، بس ہم دونوں بھائی بہن کی مرمت ہوتی رہی۔

باوا سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ تپے دار صاحب اسکوٹر پر دفتر تشریف لے جاتے تھے اور دوسرا اسکوٹر ان کے فرزند ارجمند کے استعمال میں رہتا تھا۔ وہ دسویں درجہ کے طالب علم تھے۔ ماں اس پر بھی کلکلاتی۔ مجھ سے کہتی "دیکھ کر باپ ہیڈ کانسٹیبل ہے اور تو بسوں میں لٹک کر کالج جاتا ہے۔

میں کہتا" ماں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ نہیں دیکھتی کہ مجھ سے عمر میں کتنا بڑا ہے لیکن ابھی تک ہائی سکول میں پڑا ہوا ہے ؟"

وہ مجھے بھی صلواتیں سناتے اور ساتھ ہی باوا جان کو بھی لپیٹ لیتی۔ بہر حال اس سے تپے دار کے پروسی بننے سے ہمارے گھر کا سکون رخصت ہو گیا تھا۔ باوا چھٹی میں زیادہ تر وقت مسجد میں گزارنے لگے اور ہم دونوں بہن بھائی بس کیا بتائیں کیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اندین وائے تپے دار صاحب کے یہاں تفریحات ہوتی رہتیں۔ آج کسی کی سالگرہ ہے، کل کسی کی بسم اللہ، پرسوں کسی کا عقیقہ۔ برادری سمیت کھانا ہوتا اور میری ماں انگاروں پر لوٹتی رہتی۔

بہر حال، اب میری ماں نے میری بہن کے حوالے سے بات شروع کی۔ باوا کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتی اور ایسی سناتی کہ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ کہتی۔" اس بھنگڑ خانے میں بیٹی کا رشتہ کیسے آئے گا۔ جہیز کے بغیر بیٹیاں کہاں اٹھتی ہیں ؟"

اسی دوران تپے دار کی بیٹی کی شادی ٹھہر گئی۔ وہ دھوم دھڑ کا ہوا کہ اہل محلہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بارات تھی کہ گاڑیوں کا جلوس تھا۔ کسٹم کے کلرک کو بیاہی گئی تھی۔ بری کے سامان کو

دیکھ کر ماں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے اور پھر جہیز کا کیا کہنا۔ رات کو ماں پر دورہ پڑا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ حکیم ڈاکٹر سبھی آئے اور خدا خدا کر کے کسی طرح سکون ہوا۔ صبح اٹھتے ہیں پھر باوا کی شامت آئی۔ بس کیا بتاؤں مولوی صاحب وہ کس طرح دھاڑیں مار مار کر روئے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو میرا کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔

آخر ماں سے بولے۔ ”تم ہی کچھ کرو۔ مجھ سے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ میرا منہ نہیں ہے کہ میں کسی سے کچھ کہہ سکوں۔ تمہاری کی صوبیدارنیوں سے میل ملاقات ہے۔“

ماں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہم دونوں بہن بھائی دنگ رہ گئے لیکن ہمارے لئے دم بخود رہنے کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔

پھر باپ تو ہیڈ آفس ڈیوٹی پر چلے گئے اور اماں نے رکشا منگوایا اور شہر کے سب سے بدنام کھانے کے انچارج کی بیوی سے ملنے کے لیے نکل کھڑی ہوئیں۔ ہم دونوں بھائی بہن پریشان ہوتے رہے، تو گویا اب باوا رشوت کا دھندہ کریں گے۔ ماں کے کہنے سننے میں آکر۔ میری آنکھوں کے سامنے ان کی پیشانی پر سجدوں کا نشان چمکنے لگا۔ میں نے سوچا... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ باوا جان اس راہ پر نہیں جا سکتے لیکن مولوی صاحب ہوا وہی جو بالآخر ہمارے مقدر میں تھا۔ تھانے کے صوبے دار نے اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کر کے باوا جان کو ہیڈ آفس کی محرری سے ہٹوا کر تھانے کی محرری پر لگا دیا۔ اس تھانے کا علاقہ بدمعاشوں کا گڑھ تھا۔ کئی بڑے جوئے خانے پولیس کی زیر سرپرستی چلتے تھے۔ منشیات کی غیر قانونی تقسیم بھی وہیں سے ہوتی تھی۔ اس سے تھانے کو روزانہ ہزاروں کی آمدنی ہوتی تھی۔ وصولیابی پر باوا جان لگائے گئے تھے۔

جس وقت وہ اپنا حصہ لے کر گھر میں داخل ہوتے تھے، ماں کی باچھیں کھل جاتی۔ بیٹی کے جہیز کا سامان تیار ہونے لگا۔ سال بھر کے بعد بیٹی کی ایسی شادی کی کہ تپے دار صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔

لیکن میرے باپ کا یہ عالم تھا کہ اپنی اولاد سے بھی آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا۔ گھر میں ہوتا تو زیادہ تر اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ باہر نکلتا تو آنکھیں خون کبوتر ہوتیں۔ مسجد جانا چھوڑ دیا تھا۔ گھر پر ہی نماز پڑھ لیتا، ایسا لگتا تھا جیسے اب اسے نماز پڑھتے ہوئے بھی شرم آتی ہو۔ ایک دن میں نے کہا" باواجان آپ کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ اب تو آمنہ کی شادی بھی ہو گئی۔ اب آجائیے اپنی راہ پر۔"

گلو گیر آواز میں بولے۔" بیٹے! اب میری واپسی بہت مشکل ہے۔ ان کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کروں گا تو سیدھا جیل جاؤں گا۔"

"میں خاموش رہا۔ اتنی عقل تو میں بھی رکھتا تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ صدر سکندر مرزا کی حکومت کا خاتمہ جنرل ایوب خان کے ہاتھوں ہو گیا۔ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ سماجی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔ پورا شہر صاف ستھرا نظر آنے لگا۔ سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے ناجائز پائیں باغ راتوں رات کاٹ دیئے گئے اور پھر ایک ایسا دن آیا کہ ایک جوئے خانے پر اس وقت چھاپہ پڑا جب میرے باواجان تھانے کا حصہ وصول کرنے پہنچے تھے۔ وہ بھی دھر لیے گئے لیکن دم بخود تھے۔ پھر انہوں نے سارا الزام اپنے سر لے لیا۔ یہی کہا کہ وہ ذاتی طور پر ایسا کرتے تھے۔ تھانے کے انچارج کو اس کا علم نہیں تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ ملٹری کورٹ میں ان پر مقدمہ چلا اور تین دن کے اندر انہیں دس سال کی سزا ہو گی۔ ہم لوگوں کی بہت بری حالت تھی۔ محلے والوں سے عجیب عجیب ریمارک سننے میں آتے۔ ادھر ماں کا یہ عالم تھا کہ چپ لگ گئی اور پھر ایک دن سچ مچ ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اس سے جانبر نہ ہو سکیں۔ میں تنہا رہ گیا۔ بی اے کر چکا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ایم اے میں داخلہ لوں گا لیکن جہاں بات تھی تہاں رہ گئی۔ بہن کے سسرال والوں نے بھی اب قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس کے شوہر نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب تم نے مائیکے کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھا تو طلاق دے دوں گا اور پھر مولوی صاحب... مراد علی... ہپی بن گیا۔"

”لیکن بدبخت! تجھے تو اس سے سبق سیکھنا چاہیے تھا!“ مولوی صاحب جو بہت زیادہ متاثر نظر آ رہے تھے، گلوگیر آواز میں بولے۔

”میں نے یہی سبق سیکھا ہے مولوی صاحب! اپنے معاشرے کے قول و فعل کے تضاد سے تنگ آگیا ہوں۔ آپ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا کریں گے مولوی صاحب؟“

”میں اپنے علاقے میں واپس چلا جاؤں گا۔“

”آپ ایک بار کہہ رہے تھے کہ آپ پیرزادے بھی ہیں۔“

”ہاں ہاں... میں اپنے علاقے کے گدی نشین کا بیٹا ہوں اور والد صاحب کے بعد میں ہی گدی سنبھالوں گا۔“

”پھر آپ اپنے علاقے کے لئے کیا کریں گے؟“

”رشد و ہدایت کے علاوہ اور کیا کروں گا۔“

”اس کے باوجود بھی آپ کے علاقے کے مسلمان مسلمانوں ہی کے ہاتھوں قتل ہوتے رہیں گے۔ پرانی خاندانی رنجش رنگ لاتی رہیں گی اور آپ بیٹھے دم بخود دیکھا کریں گے۔ کیسے آپ کے والد صاحب دیکھتے رہتے ہیں۔“

مولوی صاحب نے چھڑی اٹھائی اور مراد سر جھکا کر بولا۔ ”اتنا ماریے کہ آج میں مر ہی جاؤں، ورنہ مجھے جانے دیجئے۔ میں اپنا کام کروں اور آپ اپنے رشد و ہدایت میں لگ جائیے۔“

مولوی صاحب نے چھڑی ایک طرف رکھ دیں اور اداس آنکھوں سے ہپّی کو دیکھتے رہے۔ پھر ان کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے۔